محمد یوسف

لیکچرار گورنمنٹ میاں محمد نواز شریف ڈگری کالج، سرگودھا

ڈاکٹر محمد افضال بٹ

استاد شعبہ اردو، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیال کوٹ

# رشید امجد کے افسانوں میں بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کا اظہار

**Muhammad Yousaf**

Lecturer, Govt Mian Muhammad Nawaz Sharif Degee College, Sargodha

**Dr. Muhammad Afzal Butt**

Head of Urdu Department,GC Women University, Sialkot.

## Expression Of Changing Cultural Values In The Fiction of Dr. Rashid Amjid

Dr Rasheed Amjad holds a distinguished place in modern short story writers. After going through his short stories, we realize that he is vigilant writer who feels the cultural changes taking place in the society and expresses them in his short stories. The modern man has forgotten his bright past by being victim of selfishness, and is busy in exploiting the fellow human beings. This is the reason that Man has no trust now in fellow human beings. This change in values has been expressed by Dr. Rasheed Amjad in his short stories in particular. He showed in his short stories that we human beings are losing touch with nature. The residential areas are being built after cutting down trees and beauty of nature is being destroyed. Our language, food, dress and things of daily use are also undergoing change. The modern man is dependent on machines and losing touch with fellow human beings. As the time is passing, the respect for elders is also vanishing. That is why that there is a gulf and generation gap between parents and children too. After reading Rasheed Amjad's short stories we realize that after forgetting our bright cultural values we are on the last ladder of downfall path and we are totally oblivious to this. Seeing his work in terms of art, he highlights the cultural values in a very unique and artist way. The changes that have been given rise to, with changing cultural values; have also been highlighted very effectively whether they are positive or negative. Like an expert pulse

feeler he is aware of every vein of society and also expresses his grief on social decline. He also corrosively criticizes the society, but at the same time he anxiously desires the reformation in this declining social order.

**Key Words:** *Distinguish, Modern, vigilant, Cultural changes, Society, Beauty of nature, generation gap, Values, Oblivious, Reformation, declining.*

ڈاکٹر رشید امجد کا شمار جدید علامتی افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک حساس اور محب وطن پاکستانی ہیں۔ پرانی وضع قطع کی حامل شخصیت ہونے کی وجہ سے انھیں اپنے بزرگوں، ماضی اور پرانی روایات سے خاص انس ہے۔ وہ پرانی ثقافت جو ہماری پہچان اور قیمتی اثاثہ ہے کو مٹتا دیکھ کر انھیں شدید قلق ہوتا ہے۔ وہ جدید ترقی کے مخالف نہیں ہیں لیکن ترقی کے اس سفر میں وہ ماضی کی شاندار روایات کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے ہیں۔ پاکستانی ثقافت میں جہاں مثبت تبدیلیاں آئی ہیں انھوں نے ان کی تائید کی ہے لیکن جہاں قیمتی ثقافتی اثاثے کو مٹتے دیکھا ہے تو اس کا نوحہ بھی تحریر کیا ہے۔ رشید امجد نے بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کی جو عکاسی اپنے افسانوں میں کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گہری بصیرت اور وسیع مشاہدہ و مطالعہ کے عادی اصلی تخلیق کار ہیں۔ وہ جو کچھ ثقافت کے نام پر سماج میں بدلتا دیکھتے ہیں اس پر بے لاگ انداز میں اپنی رائے اور تبصرہ تخلیقی انداز میں پیش کرتے ہیں، ان کے دلائل مضبوط اور ان کے مؤقف کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو رشید امجد کے افسانوں میں بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کا اظہار بڑے واضح انداز میں نظر آتا ہے۔ یہ اظہار ان کے ہاں درسی نہیں بلکہ ان کی اپنی زندگی کے تجربات کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے جس معاشرے میں زندگی گزاری ہے اس کی ثقافت، سماج اور اس معاشرے کے لوگوں کے رویوں سے وہ خاص واقفیت رکھتے ہیں، بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار نے معاشرے کو گھٹن اور افراتفری کا شکار کیا ہے جس میں پڑ کر انسان خود سے ہی بیگانہ ہو گیا ہے، رشید امجد کی ان اقدار پر گہری نظر ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں اپنی نفسیاتی بافت اور ذہنی تشکیل کے عوامل کا تجزیہ اس انداز سے کیا ہے کہ ان کے افسانے ان کی ذات کے ساتھ ساتھ سماج اور ثقافت کا اظہاریہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ انسان کی پریشانی کے اسباب تلاش کرنا اور پھر انھیں اپنے مخصوص انداز میں تہذیب و ثقافت کو سامنے رکھتے ہوئے پرکھنا اور نتائج حاصل کرنا رشید امجد کا خاص وصف ہے۔ وہ چیزوں کو محض ان کے ظاہر سے ہی نہیں دیکھتے بلکہ ان کے باطن میں جھانک کر ان کی اصلیت تک رسائی حاصل کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے فن میں پختگی اور جاذبیت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔

بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کے سماج پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں رشید امجد کے ہاں اس کا اظہار بہت خوب صورت انداز میں ملتا ہے۔ یوں ان کے افسانے بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کے ساتھ ساتھ سماجی ابتری کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ سماجی ابتری کو نمایاں کرتے وقت انہوں نے سماج کے تمام طبقات کے تمام پہلوئوں کو مد نظر رکھا ہے۔ وہ کسی ایک طبقے کے نمائندہ بن کر نہیں ابھرے کہ وہ خاص طبقہ ہی ان کی پہچان بن جائے بلکہ انھوں نے سماج کو دیکھا ہے اور سماج میں سے ہی اپنی تخلیقات کے موضوعات کشید کیے ہیں۔ اس ضمن میں عابدہ بتول لکھتی ہیں:

> " رشید امجد کے افسانوں میں معاشرے کے بدلتے ہوئے حالات اور مستقبل کی جھلک صاف دکھائی دے رہی ہے جو باتیں رشید امجد نے چند سال پہلے بیان کی ہیں آج صرف سچائی کی دلیل ہے۔ جس طرح معاشرہ ترقی کی بجائے زوال اور پستی کی طرف جا رہا ہے۔ وقت کی رفتار ہمیں جس قدر تیزی سے پیچھے کی طرف دھکیل رہی ہے اس صورت حال کا بہت خوب صورت بیان ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔"(۱)

تقسیم کے وقت کا لہو لہو پاک وہند، معاشی بد حالی، قیام پاکستان کے بعد مارشل لاء کا نفاذ، ناکام اور نا اہل جمہوری حکومتیں اور جاگیر دارانہ اور طبقاتی نظام وہ ناسور تھے جنہوں نے پاکستانی عوام کو بد حالی اور مایوسی کی دلدل میں دھکیل دیا اور اس خطے کی ثقافتی اقدار کو بھی متاثر کیا۔ دوسری طرف سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی ہوئی جس نے پرانی ثقافتی اقدار کو تیزی سے تبدیل کیا۔ مغربی ثقافت کے اثرات نے بالخصوص پسماندہ معاشروں کو متاثر کیا جن میں پاکستان بھی شامل ہے۔ یہ وہ حالات تھے جنہوں نے پاکستان میں مجموعی طور پر ایسا ماحول پیدا کیا جس سے اعلیٰ وارفع اقدار تیزی سے تبدیل ہوتی گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد جو جدید افسانہ تحریر کیا گیا اس میں ان ثقافتی اقدار کی تبدیلی کا تذکرہ موجود ہے۔ چونکہ رشید امجد جدید اردو افسانے کے اعلیٰ تخلیق کار ہیں یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ان ثقافتی تبدیلیوں کو منفرد انداز میں بیان کیا ہے۔

معاشرے کی یک جہتی اور اس کے ساتھ ساتھ بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس وقت معاشرے میں ایک اہم مسئلہ اپنی شناخت کا ہے۔ انسان، انسان سے اس قدر بیزار ہو چکا ہے کہ ایک افراتفری کی کیفیت ہے۔ ہر کوئی ذاتی مفادات کے حصول میں لگا ہے۔ یہی مفاد پرستی آگے چل کر انسان سے اس کی پہچان تک چھین لینے کا موجب بن رہی ہے۔ انسان نے نہ صرف دوسرے لوگوں سے سماجی حوالے سے لاتعلق اختیار کر لیا ہے بل کہ خود انسان کی اپنے آپ سے بھی روگردانی سامنے آ رہی ہے۔ ماضی کے جھرونکوں میں جھانکا جائے تو یہ

حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انسان حقیقت میں ایک سماجی ستون تھا۔ سماج سے تعلقات استوار کرنا وہ اپنے فرائض میں خیال کرتا تھا۔ انسان کو انسانی عرفان حاصل تھا۔ سماجی سطح پر ایک دوسرے کے احترام اور اخوت کا جذبہ کارفرما تھا۔ پھر دھیرے دھیرے معاشرے میں مفاد پرستی نے جنم لینا اور اپنے پر پھیلانے شروع کر دیئے تو تمام تر سماجی تعلقات مفاد پرستی کی بھینٹ چڑھتے چلے گئے اور بالآخر مقامی تغیرات کی رو میں بہہ کر انسان اپنی پہچان بھی کھو گیا۔

سماجی ناہمواریوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی نئی سماجی اور ثقافتی اقدار نے جب انسان سے اس کی پہچان چھین لی تو انسان ایک عجیب طرح کی تنہائی کا شکار ہو گیا اس تنہائی نے ایک طرف تو انسان کو دوسروں سے خوف زدہ کر دیا تو دوسری طرف انسان نے اس تنہائی کے عفریت سے جان چھڑانے کے لیے دیگر چیزوں میں پناہ ڈھونڈنی شروع کر دی۔ یوں انسان کا انسان سے رشتہ کمزور اور چیزوں سے رشتہ مضبوط ہوتا چلا گیا۔ انسانوں سے انسان کے رشتے کمزور ہوئے تو معاشرے میں خلوص، اتحاد، اتفاق اور یگانگت کی فضا مکدر ہونا شروع ہو گئی۔ انسانوں کی ایک دوسرے کے معاملات سے بے رغبتی اور کنارہ کشی نے انسان کو اس کے اپنے سماج میں ہی تنہا کرنا شروع کر دیا، مفادات کے تعلقات نے معاشرے میں دھونس اور منافقت کو رواج دیا جس کی وجہ سے معاشرتی نظام کا شیرازہ بکھرتا چلا گیا۔ دوسری طرف انسان کے دل سے انسانوں کی محبت اور اہمیت نکلی تو اس کی جگہ چیزوں کی اہمیت اور محبت نے اس کے دل میں گھر کر لیا۔ انسان نے انسانوں سے زیادہ چیزوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی اور اپنے مفادات کے حصول کے لیے چیزوں کا دست نگر بنتا چلا گیا۔ چیزوں سے انسان کی وابستگی بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کا وہ بھیانک رخ ہے جس کی عکاسی ہمارے ادب میں بھی ملتی ہے۔ رشید امجد کے افسانوں میں اس حوالے سے خاصی بہترین عکاسی ملتی ہے کہ کس طرح انسان نے انسانوں کی بجائے چیزوں کو اپنا مونس، غم خوار اور تنہائی کا رفیق بنانا شروع کر دیا ہے۔

> "یہ لیمپ پوسٹ، میرا سب سے پیارا دوست ہے، جو میرے دکھ اور درد کو خوب سمجھتا ہے۔ میں نے اس سے گھنٹوں باتیں کی ہیں لیکن اس کے ماتھے پر سلوٹ نہیں آئی۔ وہ کبھی ضروری کام کا بہانہ بنا کر کھسکنے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ میری باتیں توجہ سے سنتا ہے اور میرے غم پر آنسو بہاتا ہے۔ وہ ساری رات میرے غم میں اندھیرے کے دامن پر سر رکھے روتا رہتا ہے۔ اس کی سسکیاں سن کر میں اپنے کمرے سے نکل آتا

ہوں اور اس سے لپٹ کر پہروں باتیں کرتا ہوں......اپنی باتیں، گاؤں کی باتیں، راحت کی باتیں۔"(۲)

چیزوں سے انسان کی وابستگی نے اس کو اس کرب ناک کیفیت میں لا کھڑا کیا۔ یہ کرب اور تنہائی صرف ایک شخص کا نہیں بلکہ موجودہ عہد میں ثقافتی اقدار کی تبدیلی کے شکار ہر فرد کا نوحہ ہے اس کرب کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان کے پاس اب انسان کے لیے نہ وقت ہے نہ خلوص۔ بھرے پڑے معاشرے میں اجنبیت نے ہر ایک کو اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔ ہر فرد دوسروں سے یہ توقع تو رکھتا ہے کہ وہ اس کو تنہائی کا شکار نہ ہونے دیں لیکن خود آگے بڑھنے کو کوئی بھی تیار نہیں جس کی وجہ سے معاشرہ مجموعی طور پر ابتری کی جانب مائل ہے اور یہ ابتری وہ ہے جس کی بنیادیں انسانی بے حسی پر قائم ہیں۔ اس بے حسی نے انسان کے دل سے دوسروں کے لیے اپنائیت اور خلوص کو نکال باہر کیا ہے اور اب ہر انسان محض ذاتی مفادات کے حصول کی دوڑ میں بھاگا چلا جا رہا ہے۔ کسی کو کسی سے کوئی انس یا اپنائیت نہیں ہے۔ ہر کوئی اسی کوشش میں ہے کہ وہ جلد از جلد اپنا مفاد حاصل کر لے خواہ اس کے حصول کے لیے اسے دوسروں کی خوشیوں کا خون ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ یہ بے حسی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ صبح گھر سے نکلنے والے ہر شخص کے پیش نظر صرف اور صرف اس کی ذات، اس کی اپنی عزت و ناموس اور اس کا اپنا کام ہوتا ہے اس سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں حتیٰ کہ انسانی جان کی بھی ان کے ہاں کوئی وقعت باقی نہیں رہی۔ ایک نفسا نفسی کا عالم ہے جس نے انسان کو محض اپنی ذات تک محدود کر کے رکھ دیا ہے۔

جب افراتفری اور نفسا نفسی کے عالم میں انسان اور جانوروں میں کوئی فرق روا نہ رکھا جائے تو انسانیت دم توڑنے لگتی ہے۔ پھر نہ کسی کی جان کی پرواہوتی ہے اور نہ عزت کی۔ وہ انسان جس کی جان بچانے کو پوری انسانیت کی جان بچانے سے تشبیہ دی گئی تھی اس کی قدر و قیمت اس حد تک گھٹ کر رہ گئی ہے کہ کسی کو اس کی ذرا بھی پروا نہیں۔ بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار نے انسان کو جس طرح بے حس کر کے رکھ دیا ہے اور افراتفری اور بے حسی میں انسان کے دل میں کسی دوسرے کے لیے کتنا خلوص اور ہمدردی باقی رہ گئی ہے اس کا اندازہ بھی ذیل کے اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

"اگر ان میں سے کوئی نیچے گر گیا تو......؟

وہ برا سا منہ بنا کر کہتا ہے۔

"بس لیٹ ہو جائے گی اور کیا......وقت پر دفتر نہ پہنچا تو وہ حرامی آج

پھر بکواس کرے گا۔"(۳)

گویا انسانی جان کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ یہ سوچ اس معاشرے میں کیوں کر آئی جب کہ اس معاشرے کے لیے تو باہمی خلوص اور ہمدردی بنیادی عناصر کا درجہ رکھتے تھے۔ ایسے معاشرے میں اس خود غرضی کی سوچ کے پروان چڑھنے کے پیچھے دراصل وہ سماجی اور ثقافتی عناصر ہیں جو پرانی درخشاں روایات سے ہٹ کر معاشرے میں رواج پا گئے ہیں ان عناصر نے ایک طرف تو انسان کو تنہائی کا شکار کیا ہے تو دوسری طرف انسانی جان پر مادی فوائد اور اپنی ذات کو ترجیح دینے کی روش بھی ڈالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بس سے کسی کے گر جانے کی صورت میں اس شخص کی جان سے زیادہ ہر کسی کو اپنے وقت کے ضیاع کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔

تنہائی اور نظر انداز کر دیے جانے کا یہ احساس انسان میں اس وقت شدید تر ہو جاتا ہے جب انسان خود کچھ بھی کرنے کے قابل نہ رہ جائے اور دوسروں کے رحم و کرم پر آ جائے۔ وہ شخص جس نے اپنی ساری عمر اپنی اولاد کے اچھے مستقبل کے لیے دن رات محنت کی اور اولاد کو راحت پہنچانے کے لیے اس نے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا، اپنی خواہشات اور جذبات کو اندر ہی اندر گھٹ کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا اس انسان پہ جب ایسا وقت آتا ہے کہ اس کے اپنے قویٰ مضمحل ہو جائیں اور وہ دوسروں کے رحم و کرم پر آ جائے اس حال میں دوسرے اپنی ذات میں مگن ہو کر رہ جائیں تو ایسی صورت میں انسان ٹوٹ کر رہ جاتا ہے اور اس کی آنکھوں کے بند بے اختیار کھلتے چلے جاتے ہیں کیوں کہ اولاد اور باقی لوگوں کے پاس اس وقت جو کچھ بھی ہوتا ہے اور وہ جن عہدوں پہ متمکن ہوتے ہیں انھیں وہاں تک پہنچانے میں اس شخص کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے جسے اب وہ بوجھ سمجھنے لگتے ہیں، لیکن وہ جس نے ساری عمر ان کی راحت کے لیے محنت اور مشقت میں گزار دی اسے آج ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جو انتہائی تکلیف دہ ہے۔ رشید امجد کے افسانے "جاگتی آنکھوں کے خواب" کے ایک کردار کو بھی ایک ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

"سب لوگ اسے بھول گئے ہیں۔

اس کی بیوی اس کی محبت کے خیمے سے باہر نکل گئی ہے۔ اس کے بچے اس کے پروں سے پھسل گئے ہیں۔ وہ سب زندگی کی رنگا رنگیوں میں اپنے خیمے گاڑ رہے ہیں۔

سب اسے بھول گئے ہیں۔

اور اس کی آنکھوں میں منجمد چشمے پھوٹ بہے۔"(۴)

یہ تنہائی کا دکھ ہی ہے جس نے انسان کو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس معاشرے میں کھوکھلا کر دیا ہے۔ آج کے انسان نے بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کے ریلے میں بہہ کر اپنی اصل سے ناتا ختم کر لیا اور اب صورت حال "ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے" والی بن چکی ہے۔ رشید امجد نے اپنے افسانوں میں اس صورت حال کو بڑے احسن انداز میں بیان کیا ہے۔ اصل سے کٹ جانے کا یہ عمل اس حد تک بڑھنے لگا کہ انسان کے نزدیک مقدس رشتوں کی بھی کوئی وقعت باقی نہیں رہی، اس نفسانفسی کے دور میں صورت حال یہاں تک پہنچ گئی کہ رشید امجد کے افسانے "گم راستے میں کشف" کے مطابق قریبی رشتے اس حد تک نظر انداز ہو گئے ہیں کہ:

> "تو کہیں وہ پٹرول پمپ پر ہی نہ رہ گئی ہو..... وہ اسے بٹھائے بغیر وہاں سے چل پڑا ہو؟
> لیکن پھر فوراً خیال آتا ہے کہ اس کے بعد انھوں نے ایک جنرل سٹور سے کچھ سامان بھی خریدا تھا۔
> تو شاید وہ جنرل سٹور میں۔" (۵)

فطرت سے روگردانی آج کے انسان کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ انسان نے فطری چیزوں کو ہی چھوڑنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ کائنات میں پھیلے فطرت کے حسن کو بھی ملیامیٹ کرتا چلا جا رہا ہے۔ وہ انسان جو کسی دور میں فطرت کا دلدادہ تھا جس کی ثقافت فطرت سے جنم لیتی اور فطرت سے ہی نمو پاتی تھی وہ انسان آج فطرت کے حسن کو اپنے ہاتھوں برباد کرتا چلا جا رہا ہے۔ یہ تبدیلی نہ صرف انسان کے ذہن اور رویے کے بدلنے کی عکاس ہے بلکہ ایک طرح سے انسان کی ثقافت میں تبدیلی کا بھی اظہار ہے۔ فطرت کے حسن میں پھیلے وسیع جنگلات نہ صرف حسن کا اظہار ہیں بل کہ ان میں انسان کی ثقافت کے بہت سے اسرار ہیں۔ انسان کی ثقافت اسی فطری حسن سے پروان چڑھی ہے لیکن اب اس حسن کو جس طرح برباد کیا جا رہا ہے اس کے حوالے سے اہل قلم کے ہاں خوب خامہ فرسائی ملتی ہے۔

فطرت کے حسن میں کھڑے جنگلات اور ان جنگلات میں موجود بعض پیڑوں کے ساتھ انسانی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کا پورا عہد جڑا ہوتا ہے۔ تعویذ گنڈے سے لے کر عشق و عاشقی جیسے لطیف جذبات تک کیا نہیں جو ان بوڑھے درختوں کے سائے تلے نہ پلا بڑھا ہو لیکن بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار نے انسان سے اب یہ پرانے رازدار بھی چھیننے شروع کر دیے ہیں۔ اب رواج پانے والی ثقافتی اقدار میں ان درختوں کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی بلکہ ان کو صفحہ ہستی سے مٹایا جا رہا ہے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ ایک پرانے درخت کے ختم ہونے سے تہذیب کا گھاؤ کس

قدر گہرا ہوتا جائے گا۔ رشید امجد کے افسانوں میں بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کے حوالے سے انسان کی فطرت سے روگردانی کی عکاسی بھی خوب ملتی ہے۔

"میں دیکھنے والوں کو ایک لمحہ کے لیے ہی سہی، اس جہان سے نکال کر تصور کی اس دنیا میں لے جاتی ہوں جہاں پہنچنے کے لیے لوگ برسوں برگدوں کے نیچے بیٹھ کر اپنی انتڑیاں سکھاتے تھے اور تم...... تم کہتے ہو یہ نمائش ہے۔ وہ کھڑی ہو جاتی ہے...... تم بہت چھوٹی سطح پر جی رہے ہو، تم اس لمحہ کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"(۶)

جب انسان نے فطرت اور فطری حسن سے روگردانی اختیار کی تو وہ ایک ایسے المیے کا شکار ہو گیا کہ جس سے نکلنے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ درخت، سبزہ، پھول اور ہریالی فطری حسن کے شاہکار ہوتے ہیں، اس حسن میں جہاں رعنائی اور دلکشی اپنے عروج پہ نظر آتی ہے وہیں ہر بدلتے موسم کے ساتھ ساتھ اس حسن میں فطری تبدیلی بھی واقع ہوتی چلی جاتی ہے اور پھر ان چیزوں سے وابستہ دیگر اشیا اور جانوروں کا حسن بھی اپنی ایک خاص شان رکھتا ہے۔ انسان نے جب فطرت کے حسن کو برباد کر کے رکھ دیا تو ان سے وابستہ پرندے اور دیگر ذی روح بھی یا تو ختم ہوتے چلے گئے یا پھر وہاں سے رخصت ہو گئے۔ انسان کی اپنی فطرت میں چوں کہ اس حسن میں دلچسپی موجود ہے اس لیے نئی ثقافتی اقدار کے انسان نے اپنے ذوق کی تسکین کے لیے ان پرندون اور جانوروں کے ماڈل بنا کر اور گھروں میں سجا کر اپنے ذوق کی جھوٹی تسکین کی کوشش کی ہے لیکن وہ یہ بھول جاتا ہے کہ تسکین محض مورتیاں سجانے سے نہیں ہوتی بلکہ اصل رعنائی ان پرندوں اور جانوروں کی زندگی، ان کے اچھل کود، ان کی چہچہاہٹ اور ان کے ان سریلے گیتوں میں ہوتی ہے جن سے یہ مورتیاں عاجز ہیں۔ جب انسان نے اصل کی بجائے ان نقلی اور خودساختہ چیزوں میں تسکین کے ذرائع تلاش کرنے کی کوشش کی تو ان سے اسے محض ظاہری سجاوٹ ہی حاصل ہوئی باقی سب کچھ اس کی اپنی زندگی سے بھی رخصت ہو گیا یوں اس تبدیلی نے ثقافتی سطح پر اسے اصلیت کی بجائے مصنوعی چیزوں کی طرف راغب کرنا شروع کر دیا یہی وجہ ہے کہ سماجی سطح پر ثقافتی اقدار محض دکھلاوہ ہی بن کر رہ گئی ہیں، رشید امجد نے فطرت کا گہرا مشاہدہ کیا ہے وہ فطری حسن کے اسرار و رموز سے خاصی واقفیت رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کا مطالعہ کیا جائے تو اس لطیف پہلو پر بھی نظر پڑتی ہے۔ ذیل کے اقتباس میں دیکھیے کہ کس طرح انہوں نے فطری اور مصنوعی حسن کا موازنہ کیا ہے:

"سب کچھ بکھر گیا ہے، ان منظروں میں چہچہاتے پرندے اپنی اپنی ڈالیوں سے اڑ کر جانے کن کن پنجروں میں کہاں کہاں بند ہو چکے ہیں، وقت کے صیاد نے ہمیں اپنے جال میں پکڑ کر زمانے کے بے رحم ہاتھوں بیچ دیا ہے اور زمانے نے ہمیں اپنے ڈرائنگ روموں میں سجا لیا ہے، جہاں نہ آواز ہے نہ چہرہ، آوازوں اور چہروں کے بغیر زندگی عجیب مضحکہ خیز محسوس ہوتی ہے۔"(۷)

انسان نے نئے طرز رہائش اختیار کرنے کے لیے جب شہروں کی بنیاد ڈالی تو سب سے پہلے درختوں پہ آرا چلا جو اپنے دامن میں ایک پورے عہد کی تہذیب لیے ہوئے تھے۔ جب وہ درخت مٹے تو ان کے ساتھ ہی وہ تہذیب اور ثقافت مٹتی چلی گئی اور اس کی جگہ دکھلاوے کے سٹیج بنتے چلے گئے۔ برگد کے درخت سے سٹیج تک کا سفر دیکھا جائے تو یہ محض درختوں کے کٹنے کا ہی سفر نہیں بلکہ بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کے تناظر میں یہ تہذیب کا سفر ہے۔ وہ تہذیب جو اپنی سادگی میں بھی بے پناہ حسین تھی اس تہذہب کے مٹنے کا یہ نوحہ ہے۔ برگد کا درخت ہو یا کوئی بھی اور درخت اس کا اپنا ایک حسن ہے اور وہ اس حسن کے اظہار کے لیے کسی کا محتاج نہیں۔ تھکے ماندے اور ہارے ہوئے لوگ اس کے نیچے آ کر اس قابل ہو جاتے ہیں کہ ایک نئی امنگ اور ایک نیا جذبہ لے کر ابھرتے ہیں۔ گویا برگد کا درخت لوگوں کا رہنما بن کر سامنے آتا ہے، وہ کبھی ویران نہیں ہوتا بلکہ ویرانوں کو رونق بخشتا ہے۔ اس کے مقابلے میں بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کے نتیجے میں سامنے آنے والے سٹیج کی حقیقت دیکھیے کہ اس نے خود کسی کا رہنما کیا بننا ہے وہ تو خود دوسروں کے رحم و کرم پہ ہے اور اس وقت تک ہی مرکز نگاہ ٹھہرتا ہے جب تک اس پہ کردار کام کر رہے ہوں۔ کرداروں کے ہٹتے ہی اس پہ ویرانی چھا جاتی ہے۔

دوسری طرف دیکھا جائے تو درخت کے ساتھ پلنے بڑھنے والی ثقافت میں ''گوری کا ہاتھوں میں دودھ کا پیالہ'' پکڑے محبوب کا انتظار کرنا ایک بہت لطیف جذبے کو سامنے لاتا ہے۔ جبکہ سٹیج کی صورت میں ایسا کچھ بھی ممکن نہیں۔ یہ بات تو درست ہے کہ سٹیج پر بھی ایسا سب کچھ ہوتا ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ سب دکھلاوا اور محض وقتی تفریح کے لیے ہوتا ہے اس میں اپنائیت اور خلوص کا جذبہ نہیں بلکہ ایک مشینی تحرک ہے جبکہ پیڑ کی ثقافت میں جذبہ اور خلوص کو خاص عمل دخل حاصل ہے۔ رشید امجد نے اپنے افسانوں میں اس حقیقت کو بڑے احسن انداز میں واضح کیا ہے۔ ان کی بدلتے ہوئے ثقافتی رویوں اور اقدار پر گہری نظر ہے اور وہ ان کے حوالے سے خاصا علم رکھتے ہیں۔ رشید امجد کا افسانہ ''جنگل شہر ہوئے'' اس حوالے سے خاصا اہم ہے۔ اس افسانے میں انہوں نے

بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کے نتیجے میں پیدا ہونے والے کھوکھلے پن کو نمایاں کیا ہے۔ اسی افسانے سے ایک اور اقتباس دیکھیے:

> "اسی لمحہ وہ اس پرانی دنیا سے نکل کر نئے جہان میں داخل ہوا تھا۔ لیکن یہ تو پرانی بات ہے، اب نہ برگد ہے............ نہ دودھ کا پیالہ جس سے زندگی قطرہ قطرہ اس کی انتڑیوں میں اتری تھی......
>
> وہ آنکھیں جھپکتا ہے...... سٹیج کے پیچھے نہ ختم ہونے والے فاصلوں کا خلا ہے اور آگے تیز روشنیوں میں وہ دھندلے عکس کی طرح...... تماشائیوں کی سیٹیوں، کراہوں اور لذت بھری آہوں کے درمیان زپ کھولتی ہے، زپ کے کناروں سے ہی اس کے گورے بدن کا دریا اچھل کر باہر آتا ہے۔"(۸)

پرانی شائستہ اور مہذب ثقافت اور موجودہ کھوکھلی ثقافت کا فرق اس اقتباس سے بہت نمایاں انداز میں سامنے آتا ہے۔ وہ دور جب محبوبہ برگد کے درخت کے نیچے گورے ہاتھوں میں دودھ کا پیالہ تھامے منتظر ہوتی تھی اس دور میں رشتوں کی قدر تھی۔ وہ محبوبہ جو اپنے محبوب کی خاطر برگد کے نیچے کھڑی ہوتی تھی ذرا تصور کیجیے کہ اس کے جذبات کیا ہوں گے اور دوسری بات کہ مجال ہے جو اس کے ذہن میں اپنے محبوب کے علاوہ کسی دوسرے کا خیال تک بھی آ جائے۔ لیکن یہاں ایک دو نہیں سیکڑوں کی تعداد میں تماشائی اکٹھے ہو کر ایک کے جسم کے نظاروں سے لذت حاصل کر رہے ہوتے ہیں گویا اب محبت اور جذبات کی حد محض جسمانی لذت تک رہ گئی ہے اور یہی وجہ ہے یہ لذت انہیں مسرت دینے سے قاصر رہتی ہے کیوں کہ مسرت اک دائمی کیفیت نفسی کا نام ہے جب کہ لذت وقتی ہوتی ہے۔ ذرا آگے بڑھیے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس وقتی لذت کے لیے بھی کوئی خاص معیار اور اقدار نہیں بلکہ موقع محل کی مناسبت سے جو بھی مل گیا اسی سے کام چلا لیا اور ایک کے بعد ایک کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ گزشتہ ثقافتی اقدار کے مقابلے میں موجودہ ثقافتی اقدار نے انسان کو مسرت کی بجائے لذت کا متمنی بنا دیا ہے اور اب وہ معیارات پر سمجھوتہ کرنا ہی نہیں سیکھ گیا بلکہ اقدار اور روایات سے روگردانی میں بھی اسے کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تلاش اور جستجو کسی منزل پہ نہیں پہنچ پاتی کیوں کہ اس کی منزل محض وقتی لذت ہے وہ کبھی بھی پوری نہیں ہو پاتی۔ ڈاکٹر رشید امجد کے ہاں شائستگی اور اخلاق سے تہی دست ثقافت کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں:

"دروازے سے ایک ہیجڑا اندر داخل ہوتا ہے اور درمیان میں پہنچ کر ناچنے لگتا ہے، اس کے ساتھ ہی جھکے ہوئے چہرے اوپر اٹھنے لگتے ہیں اور پتھر کے دھڑ پگھلنے لگتے ہیں، ہیجڑا ناچتے ناچتے کبھی کسی کے سر پر چپت رسید کرتا ہے، کبھی کسی کے گال پر چٹکی لیتا ہے تو لوگ خوشی سے تالیاں پیٹنے لگتے ہیں۔ ہیجڑا ناچتے ناچتے باہر نکل جاتا ہے، اٹھے ہوئے سر دوبارہ ڈھلک جاتے ہیں اور وجود پتھر میں ڈھلنے لگتے ہیں۔"(۹)

یہ تبدیل شدہ تقاضے کی ایک جھلک ہے اس کے مقابلے میں اگر ماضی کی ثقافت کو دیکھا جائے تو ناچ گانے سے خوش ہونے اور خوشی منانے کے بہت سے انداز ہمیں ماضی کی ثقافت میں بھی ملتے ہیں لیکن اس ثقافت میں جو ایک رکھ رکھاؤ، شائستگی اور مہذبانہ انداز تھا وہ موجودہ ثقافت میں ناپید ہو چکا ہے۔ اسی کی عکاسی ہمیں رشید امجد کے ہاں ملتی ہے۔ ان کے افسانوں میں جہاں موجودہ ثقافت کی عکاسی پورے منظر نامے کے ساتھ سامنے آتی ہے وہیں قاری تھوڑی دیر کے لیے ماضی کے نہاں خانوں میں جھانکنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے کہ اصل ثقافت کیا تھی اور اب اسے کس طرح غیر شائستہ حرکات کا مرقع بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

ہیجڑے کے ناچتے ہوئے آنے اور پھر تہذیب و شائستگی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کسی کے سر پر چپت رسید کرنے اور کسی کے گال پر چٹکی کاٹنے سے جو بدتہذیبی اور نامعقولیت سامنے آتی ہے وہی اصل میں تبدیلیٔ ثقافت ہے۔ سماج کے اندر ثقافتی اور سماجی تبدیلی افقی اور عمودی دونوں طرح سے واقع ہوئی ہے بالکل اسی طرح خوشی کے تہوار پر بلائے جانے والے یہ رقاص آج کے دور میں خود میں ایک تبدیلی لے آئے ہیں یہی تبدیلی سماج میں بھی منتقل ہوتی جا رہی ہے۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو سماج اور سماج سے وابستہ ان افراد میں ثقافتی تبدیلیاں ایک دوسرے کے ذریعے پیدا ہو رہی ہیں۔ ایک طرف سماج میں ان چیزوں کا چلن عام ہو رہا ہے کہ تہذیب و شائستگی معدوم ہوتی جا رہی ہے اور تمام تر ترقی کے باوجود اخلاقی زوال واقع ہوتا جا رہا ہے تو دوسری طرف ان ثقافتی نمائندوں کے ہاں بھی تہذیب و شائستگی دم توڑتی جا رہی ہے۔ ورنہ کہاں وہ دور کہ جس میں رقاصہ ایک گھونگھٹ اٹھاتے ہوئے بھی سو طرح کے آداب بجا لاتی تھی اور کہاں آج کی رقاصہ کہ تمام تر تہذیب سے لاعلم ہونے کا ثبوت بن کر سامنے آتی ہے۔ یہی ثقافتی تبدیلی رشید امجد کے افسانوں میں کھل کر سامنے آتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ رشید امجد کا سماج اور ثقافت کا نہ صرف مطالعہ وسیع ہے بل کہ ان کے مشاہدے میں بھی خاص وسعت پائی جاتی ہے اور یہی وسعت مشاہدہ انھیں ثقافت کے تغیرات پر سوچنے اور پھر بیان کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

شائستگی اور اخلاقیات سے عاری ہونے کا یہ رویہ معاشرے کے عام لوگوں میں بھی سرایت کرتا چلا جارہا ہے اور اس سے بڑھ کر افسوس ناک صورت حال یہ ہے کہ اس کو برا سمجھنا بھی چھوڑ دیا گیا ہے۔ نام نہاد سیکولرازم کی آڑ میں خواتین کی تضحیک معمول بن چکی ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں جس کی وجہ سے ایسے بدقماش اور آوارہ لوگوں کو کھل کھیلنے کے مواقع مل رہے ہیں جنہیں ہمارا سماج ثقافت میں تبدیلی کے نام پر قبول کرتا چلا جارہا ہے۔ رشید امجد نے خود کو اس عوام کے بیچ کھڑا کر کے اس عوام کو اس بد اخلاقی سے آگاہ کیا ہے:

> "اگلے سٹاپ پر بیٹھی ہوئی دو عورتیں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ گزرنے کے لیے راستہ بالکل نہیں، دروازے تک آدمی ہی آدمی ہیں۔ وہ مردوں سے ٹکراتی دروازے کی طرف بڑھتی ہیں۔ مرد اور پھیل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ دونوں بڑی مشکل سے نیچے اترتی ہیں۔ اس وقت ان کی حالت لیموں کش سے نکلے لیموں کی سی ہے۔ بس دوبارہ گھسٹنے لگتی ہے۔ میرے قریب کھڑے دو نوجوان ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اترنے والیوں کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔"(۱۰)

بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار نے انسان کی نظروں سے حیا اور مروت اس طرح چھین لی کہ اس کے نزدیک کسی غیر محرم کی کوئی آبرو اور عزت باقی نہیں رہی۔ ایک وقت وہ تھا جب بازار سے گزرتی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن اب جو ثقافتی اقدار پروان چڑھ رہی ہیں ان میں یہ سب جائز ہوتا چلا جارہا ہے۔ آج بس سٹاپ سے لے کر بڑے بڑے اداروں تک میں عورت نہ صرف یہ کہ محفوظ نہیں بلکہ اس کی تحقیر اپنے عروج پہ دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ سب کیا دھرا اس نئی ثقافت کی تشہیر کا ہے جس نے عورت کو گھر کی چاردیواری سے نکال ترقی کے خواب دکھاتے ہوئے سر بازار لا کھڑا کیا ہے۔ اب دفتر یا کسی بھی کام پہ صبح کو نکلنے والی یہ حوا کی بیٹی سارا دن مختلف لوگوں کی نظروں کے تیر جھیلتی رہتی ہے تب جا کر اس کی زندگی کی گاڑی آگے بڑھتی ہے۔

ثقافتی اقدار میں معاشرتی ناہمواریوں کے حوالے سے جب ہم آگے بڑھتے ہیں تو ایک اور الم ناک حقیقت سامنے آتی ہے، ایک دور وہ تھا کہ تحفہ محبت اور خلوص کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ تحفہ خریدنے والا جب سیکڑوں ہزاروں چیزوں میں سے کسی کے لیے کسی ایک چیز کا انتخاب کرتا تھا تو دراصل اس کے پیچھے وہ جذبہ اخوت اور جذبہ محبت ہوتا تھا جو معاشرتی اور سماجی اقدار کی بنیاد بنتا تھا پھر ذرا غور کریں تو تحفے کی نوعیت بھی ثقافتی اقدار اور

ثقافت کو نمایاں کرتی ہے۔ ہر دور میں تحفے تحائف اس دور کے ثقافتی ترجمان بن کر سامنے آتے رہے ہیں۔ لیکن موجودہ دور میں ثقافتی تغیرات نے تحفہ تحائف دینے کے عمل میں بھی جو تبدیلی پیدا کی ہے اس کی ایک جھلک دیکھیے:

" بچے کہاں ہیں؟

"پڑوس میں گئے ہیں، گڈو کی سالگرہ ہے"

اچھا............وہ چونکا......"تو بچوں کو کوئی تحفہ دینا تھا خالی ہاتھ گئے ہیں کیا؟"

"کیا لے کر جاتے "

کمال کرتی ہو وہ جھنجھلا گیا......" تمہیں پتہ بھی ہے کہ گڈو کے ابو اسٹیبلشمنٹ میں ہیں، دس کام ہوتے ہیں ان سے اور ابھی تو میری سنیارٹی کا معاملہ بھی پھنسا ہوا ہے۔" (۱۱)

اب یہاں دیکھا جائے تو موجودہ عہد میں تحفہ تحائف کی اصلیت سامنے آتی ہے۔ یہاں تحفہ محبت نہیں بلکہ ایک طرح کی رشوت کے طور پر دیا جارہا ہے اور یہ رشوت بھی وہ ہے جو کسی خاص کام کے لیے نہیں بلکہ مجموعی فضا کو اپنے حق میں کرنے کے لیے دی جارہی ہے کہ جب کبھی کوئی ضرورت پڑے تو اپنا کام آسانی سے کروا کر اپنے مفادات کا حصول ممکن بنایا جاسکے۔ یہاں محبت کی بجائے ذاتی مفادات جس کلچر کو پروان چڑھا رہے ہیں اس نے سماج کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ صرف یہ ہی نہیں اس مفادات کی دوڑ میں پڑ کر انسان خود سے بے گانہ ہو گیا ہے اور اس کی زندگی کا مقصد محض ترقی اور اچھا عہدہ بن کر رہ گیا ہے۔ جب یہ صورت حال ہو گی تو معاشرے میں پروان چڑھنے والی ثقافتی اقدار بھی مفاد پرستی کے گرد ہی گھومیں گی کیوں کہ ثقافتی اقدار کے فروغ اور پروان چڑھانے میں اہم عمل دخل جذبہ اور احساس کا ہوتا ہے۔ ثقافت جذبے سے پھوٹتی اور احساس سے پروان چڑھتی ہے۔ جب جذبے اور احساس میں کھوٹ پیدا ہو جاتا ہے تو معاشرتی ناہمواریاں جنم لیتی ہیں اور یہی معاشرتی ناہمواریاں ثقافت کی پامالی کا باعث بننے کے ساتھ ساتھ مجموعی سماجی منظر نامے پر بھی بد نما داغ لگاتی چلی جاتی ہیں اور پھر ایک ایسا سماج سامنے آتا ہے جس کی ثقافت تہذیب اور شائستگی سے عاری ہونے کے ساتھ ساتھ ماضی کی اخلاقیات سے بھی تہی دامن ہوتی چلی جاتی ہے۔ رشید امجد کے افسانوں میں معاشرتی ناہمواریوں کی وجہ سے ہونے والی جن ثقافتی اقدار میں تبدیلیوں کو واضح کیا گیا ہے ان کے پیچھے بھی یہی محرکات ہیں۔ جذبہ اور احساس کے فقدان اور ان کی غلط سمت نے سماج کا شیرازہ تو بکھیرا ہی ہے ثقافتی اقدار پر بھی کاری ضرب لگائی ہے۔

ثقافتی اقدار میں تبدیلی نے جہاں ماضی کی اقدار کو بھلانے کی طرف انسان کو مائل کیا اور انسان بتدریج اپنے ماضی کی اقدار اور روایات کو بھولتا چلا گیا وہیں ان ثقافتی اقدار کی تبدیلی کے ریلے میں بہہ کر انسان کا مقدر تنہائی جسمانی نہیں بل کہ فکری اور احساساتی سطح پر ہونے والی تنہائی ہے جو جسمانی تنہائی سے زیادہ اذیت ناک شے ہے۔ انسان ذہنی اور روحانی سطح پر تنہا ہوتا گیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی ایک گھن چکر بنتی چلی گئی۔ انسان اس قدر مصروف ہو کر رہ گیا کہ اس کے پاس اس کے اپنے لیے بھی وقت نہیں بچا "صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا" کے مترادف اس کی زندگی اور تمام تر توانائیاں اسی زندگی کی گاڑی کو کھینچنے میں صرف ہونے لگیں۔ انسان اپنی پہچان تو ان ثقافتی اقدار میں تبدیلی سے کھو ہی چکا تھا اب وہ اپنی مسرتیں بھی اس ثقافتی تبدیلی کی نذر کرنے لگا۔ رشید امجد کے ہاں اس گھن چکر کی عکاسی ملاحظہ ہو:

> " صبح چھ بج کر پندرہ منٹ پر الارم کے ساتھ اٹھنا، شیو کرنا، دانت صاف کرنا، ناشتہ، بچوں کو سکول چھوڑنا، دفتر...... ایک فائل، دوسری، تیسری، بچوں کو سکول سے لینا ...... گھر واپسی کھانا، سونا، اٹھ کر ٹی وی دیکھنا...... رات سونا، صبح پھر وہی چھ بج کر پندرہ منٹ پر الارم کی آواز۔" (۱۲)

اب ذرا اس پیرا گراف پر غور کریں اور ماضی کے جھروکوں میں جھانکیں تو اقدار میں تبدیلی واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ وہ ماضی جس میں الارم کا تصور تک نہ تھا بلکہ جاگنے کے لیے تہجد کی نماز یا زیادہ دیر سے جاگنے کی عادت ہو تو فجر کی نماز کا وقت مقرر تھا۔ اس ثقافت میں اقدار کا جائزہ لیں تو ماضی کا انسان اپنی صبح کا آغاز بے فکری او رانتہائی سکون سے یادِ الٰہی میں مصروف ہو کر کرتا تھا پھر دن بھر کے مشاغل کے دوران بھی وہ تمام اخلاقی اقدار جو حقیقت میں اس کی ثقافت کی بنیاد ہوتی تھیں ان پر کاربند رہتے ہوئے گزارتا تھا۔ یہ پیسے کی دوڑ تھی اور نہ ہی مفاد پرستی۔ احساس، جذبہ اور اخوت اعلیٰ اقدار تھیں۔ وقت نے کروٹ لی اور انسان آلات کا پابند ہوتا چلا گیا، آلات کی پابندی نے انسان سے اقدار کی پابندی چھین لی یوں ثقافتی اقدار احسان اور جذبے کی بجائے آلات کی مرہون منت ہوتی چلی گئیں اور انہی آلات نے انسان کی زندگی کو گھن چکر میں تبدیل کر کے رکھ دیا۔ جب تک انسان کی اقدار اور ثقافت احساسات اور جذبے کی مرہون منت رہی وہ آزاد تھا لیکن جب وہ آلات کی طرف لوٹا تو آلات کا پابند ہو کر رہ گیا۔ جب انسان جذبے اور احساس کی بجائے اشیاء اور آلات کا پابند ہوا تو فطرت سے دور ہوتا چلا گیا یہی وہ ثقافتی اقدار کی تبدیلی تھی جس نے انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیا۔

رشید امجد کے افسانوں میں بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کے معاشرے پر اثرات کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کے افسانوں میں بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کے نتیجے میں معاشرے میں جو رویے پروان چڑھے ہیں ان میں سے ایک اہم رویہ بے اعتباری کا ہے۔ بے اعتباری یا بے اعتمادی آج کے دور کے انسان کا بڑا المیہ ہے۔ آج کسی کو کسی پر اعتماد نہیں رہا لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ انجان لوگوں پر بھی لوگ اعتماد کر کے چلتے تھے۔ ہمیں ان گنت واقعات اور کہانیاں ایسی ملتی ہیں جن میں دو انجان مسافروں میں اعتماد کا ایسا بندھن بندھا کہ عمر بھر ان میں رفاقت قائم رہی لیکن اب وہ دور ہے کہ ثقافتی اقدار کی چکا چوند کے باوجود اعتماد رخصت ہو چکا ہے۔

ثقافت اجتماع کی پہچان ہوتی ہے۔ ثقافت کے ذریعے لوگ ایک دوسرے سے بندھے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے میں یوں مدغم ہو جاتے ہیں کہ ان کی انفرادیت کی تمام خوبیاں اور نقائص ان کی ثقافت میں باہم مل کر ایک نیا حسین امتزاج بناتی ہیں اور یہی امتزاج ان کی پہچان بنتا ہے۔ آج کئی خطے اور ان کے باشندے محض اپنی ثقافت اور ثقافتی اقدار کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں لیکن بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار نے جب فرد کے احساسات اور باہمی خلوص پر ضرب لگائی اور جذبے کی جگہ مادیت نے لے لی تو وہ سترِ بے اعتمادی کا شکار ہو گیا۔ یہی بداعتمادی آگے بڑھ کر ذہنوں پر ایک ایسا خوف مسلط کرنے کا باعث بنی جس کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ اب صورت حال اس قدر دگرگوں ہے کہ دلوں کے فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں اور ان میں قائم خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔ بدترین صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب حملہ کرنے والا کوئی بھی نہ ہو لیکن حملے کا خوف پھر بھی دامن گیر ہو۔ نیچے دیئے گئے اقتباس میں بیان کردہ منظر نامے پر غور کریں تو واضح ہوتا ہے کہ آگے اور پیچھے والا دونوں ایک نامعلوم خوف کے زیر اثر ہیں۔ یہ نامعلوم خوف ان بدلتی ہوئی اقدار کی وجہ سے دلوں میں اور ذہنوں پر تسلط قائم کر چکا ہے جنہوں نے انسانوں کے دلوں سے جذبہ و احساس نکال کر مادیت کو بھر دیا ہے۔ یہ خوف اور بداعتمادی کی فضا معاشرے کی سماجی اور ثقافتی اقدار کے زوال کی علامت ہیں:

> " بس سٹاپوں پر لائن نہیں ہے۔ وہ ایک دوسرے کے آگے پیچھے کھڑے ہونے میں خوف محسوس کر رہے ہیں۔ ہر کوئی دوسرے سے فاصلے پر کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ بسیں اور ویگنیں خالی جا رہی ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر بیٹھنے اور کھڑے ہونے کی

بجائے سب پیدل چل رہے ہیں۔ بھاگ رہے ہیں۔ چلتے ہیں رک جاتے ہیں رک جاتے
ہیں، پھر چل پڑتے ہیں۔" (۱۳)

بدلتی ہوئی سماجی اور ثقافتی اقدار نے انسان کو اندر سے اس حد تک کھوکھلا کر دیا ہے کہ منافقت اور کھوکھلا پن کی وجہ سے ایک تو وہ خود اپنی پہچان کھو چکا ہے تو دوسری طرف دیگر انسانوں کے سامنے بھی اس کے کئی روپ آرہے ہیں۔ سماجی سطح پر ہونے والی اس ذہنی اور نفسیاتی پراگندگی کا اثر ثقافتی سطح پر مختلف تغیرات لے کر آیا۔ اخلاق اور دیانت داری کے ساتھ ساتھ سب روشن اور زریں ثقافتی اقدار قصہ پارینہ بنتی جارہی ہیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو رشید امجد کا افسانہ "بیزار آدم کے بیٹے" خاص اہمیت رکھتا ہے۔ گھر جو کہ انسان کے لیے ایک جنت کا درجہ رکھتا ہے۔ انسان جہاں بھر کی تمام مشکلات اور تکالیف اٹھانے کے بعد جب واپس گھر لوٹتا ہے تو گھر میں داخل ہوتے ہی وہ اپنے آپ کو کافی حد تک پرسکون محسوس کرنے لگتا ہے۔ گھر ثقافت کا نمائندہ ہوتا ہے۔ کسی بھی سماج کی ثقافت کے لیے گھر ایک اکائی کا کام کرتا ہے لیکن بدلتی ہوئی ثقافتی اقدر نے جہاں دیگر بہت سے سماجی رویوں پہ کاری ضرب لگائی، وہاں انسان سے اس کے گھر کا سکون بھی چھین لیا ہے، اب صورت حال یہ ہے کہ رشید امجد کے الفاظ میں انسان چیخ اٹھتا ہے کہ:

"پتہ نہیں کس بے وقوف نے کہا تھا کہ گھر جنت ہوتی ہے۔" وہ کچھ سوچتا رہتا
ہے، پھر کہتا ہے...... "یار ہم گھر سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں؟"
"ہاں واقعی"...... میں سوچنے لگتا ہوں۔
"شاید اس لیے کہ وہاں گدھ رہتے ہیں...... ہے نا؟"
"شاید یہی وجہ ہو یا کچھ اور ہو۔" (۱۴)

صرف یہی نہیں بلکہ آگے چل کر گھر کے مکینوں اور خاص طور پر ماں جو کہ گھر کا ایک اہم ستون، خلوص و چاہت کا پیکر اور محبت و پیار کا انمول نمونہ ہوتی ہے۔ جس کے قدموں میں اللہ تعالیٰ نے جنت کی بشارت رکھ دی ہے۔ وہ ماں جو اولاد اور گھر پہ اپنی جان تک نچھاور کر دیتی ہے، اس کے بارے میں خیالات ملاحظہ ہوں:

"میری ماں سے تو یہ بیرا ہی اچھا ہے۔" میں اس کی تائید کرتا ہوں......"بے شک یہ
ہمارا باپ ہے، ہماری ماں ہے، ہمارا بھائی ہے اور یہ ہوٹل ہمارا گھر ہے۔" (۱۵)

اس بیان کے پس منظر میں جائیں تو اس کے پیچھے ثقافتی اور سماجی ابتری کی ایک پوری داستان کھڑی نظر آئے گی۔ انسان نے بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کی رو میں بہہ کر جب رشتوں کی ناقدری کی تو اس کے لیے ہر وہ جگہ باعث آزار بن گئی جو اس کے لیے باعث سکون تھی۔ اور یوں انسان اپنی اصل سے اکھڑتا چلا گیا۔ اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ:

"ہمارا نہ کوئی گھر ہے، نہ کوئی بیوی اور نہ ہی ہماری جیب میں کوئی کارڈ ہے۔" (۱۶)

موجودہ ثقافت کی ایک اور بیماری اشتہار بازی ہے۔ انسانی صلاحیتوں کو خریدنے کے لیے ایسے خوش نما طریقے اپنائے گئے کہ اب انسان کو اپنی انسانیت کے زوال کا احساس تک نہیں ہوتا۔ موجوہ دور میں ملٹی نیشنل کمپنیوں نے انسانی صلاحیتوں کی خرید و فروخت اپنی اشیاء کی تشہیر کے لیے شروع کر رکھی ہے۔ اب ایک انسان ایک ہی وقت میں مختلف چیزوں کا اشتہار بنا نظر آتا ہے۔ اس انسانی زوال کو ثقافتی ترقی اور سماجی بہتری کے خوش نما لبادوں میں لپیٹ کر پیش کیا جا رہا ہے جس کی وجہ سے ایک طرف تو معاشرے میں اس کے خلاف توانا آواز بھی نہیں اٹھتی دوسرا اسے معمول کی بات سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں اس اشتہار بازی کی آڑ میں اپنا مفاد حاصل کیے جا رہی ہیں اور انسان کا ہر روپ ان کے ہاتھوں غلام بنے ان کے اشاروں پہ چلتا جا رہا ہے۔ اس اشتہار بازی نے انسان سے اس کے سوچنے سمجھنے اور اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کا ہنر چھین لیا ہے، اب ایسے انسانوں کی زندگی محض دوسروں کی اشیاء کی فروخت کرنے کے لیے وقف ہو کر رہ گئی ہے اور اس کے نتیجے میں آج کے انسان کا جو اخلاقی و روحانی نقصان ہو رہا اس کی طرف اس کی نظر ہی نہیں جاتی۔ وہ عورت جو ہماری مسلم ثقافت میں امور خانہ داری کرتی تھی، سماجی نظام کا ایک اہم عنصر تھی اور اس پر خاندانی نظام کا انحصار تھا وہ اب انہی اشتہاروں کی بھینٹ چڑھ کر ہر گلی کوچے، بازار اور مختلف جگہوں پر اشتہاروں میں لٹکی دعوتِ نظارہ دیتی نظر آتی ہے۔ اور اس سے بڑھ کر افسوس ناک صورت حال یہ ہے کہ اسے ثقافت اور ترقی کا نام دیا جا رہا ہے۔ رشید امجد نے اپنے افسانوں میں اس نام نہاد ترقی اور ثقافتی تبدیلی کو بھی بیان کیا کہ کس طرح انسان کو مادی مفادات کے حصول کی خاطر استعمال کیا جا رہا ہے۔ ان کے افسانے" طناب ٹوٹا خیمہ" میں ایسا ہی منظر نامہ سامنے آتا ہے۔

"وہ حیرت سے ادھر اُدھر دیکھتا ہے اور اس کی نظر دکانوں پر لگے سائن بورڈوں
پر جا رکتی ہے
عورت چائے کے ایک اشتہار پر چپکی ہوئی ہے۔

مرد سگریٹ کے ایک اشتہار پر کھڑا ہے۔

اور بچہ...... دودھ کے ایک اشتہار پر گلاس ہاتھ میں لیے کچھ کہہ رہا ہے۔" (۱۷)

اس اشتہار بازی میں اشتہار دینے والی کمپنیاں ہر عمر کے لوگوں کو اپنے مفادات کی خاطر نہایت کم معاوضے پر استعمال کرتی ہیں اور ایک خاص عرصے تک ان کی صلاحیتوں سے کام لینے کے بعد انھیں اس طرح بے یارو مددگار چھوڑ دیتی ہیں کہ ان کا کوئی پرسان حال نہیں رہتا۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کمپنیاں اپنے مفادات حاصل کر چکی ہوتی ہیں اور معاشرہ ایسے لوگوں کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس ثقافتی معاشرے میں روزانہ دیکھتے ہیں کہ بہت سے ایسے لوگ جو اس اشتہار بازی اور ثقافتی سرگرمیوں کے نام پر دیگر بہت سے کاموں میں لگے ہوتے ہیں۔ خواہ وہ اداکار ہوں، گلوکار ہوں یا کسی بھی دوسرے ایسے شعبے سے وابستہ ہوں جسے ثقافتی رنگ دیا گیا ہو، ایسے لوگ ایک خاص عرصے کے بعد جب اس کام کے قابل نہیں رہتے تو بے کار ہو جاتے ہیں۔ انھیں نہ معاشرہ قبول کرتا ہے اور نہ ہی ان کا اپنا وہ ادارہ قبول کرتا ہے جس کی ترقی کے لیے انھوں نے اپنی زندگی کا بہترین وقت صرف کیا ہوتا ہے، وہ آخر کار معاشرے کا دھتکارا ہوا طبقہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ موجودہ ثقافت کا یہ ایک بڑا نقصان ہے کہ ثقافتی سرگرمیوں کی آڑ میں جن لوگوں کی صلاحیتوں سے کام لیا جاتا ہے، وہ قابل لوگ اس کام کے اختتام پر پہنچنے کے بعد کسی کام کے نہیں رہتے۔ ایسی ثقافت کھوکھلے پن کا شکار ہو جاتی ہے اور یہ کھوکھلا پن پھر افراد معاشرہ کے مجموعی اعمال میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے یوں ثقافت کے نام پر رواج دینے والی سرگرمیاں انسانی صلاحیتوں کے استعمال کے بعد انسان کو ضائع کرنے میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ مادی مفادات کی خاطر ایسی ثقافتی سرگرمیوں میں پڑنے والے انسان اپنے مستقبل کے بارے میں ایک غیر مطمئن صورت حال کا شکار رہتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی صلاحیتیں ضائع ہوتی چلی جاتی ہیں۔ رشید امجد کے افسانوں میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن میں انھوں نے ثقافت کی آڑ میں انسانی صلاحیتوں کے زوال کے نوحے بیان کیے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ان معاشرتی برائیوں کو بڑے واضح انداز میں بیان کیا ہے جن کی وجہ سے معاشرہ ثقافتی ترقی کے نام پر انسانی اقدار کے زوال کا شکار ہوتا چلا جا رہا ہے۔

بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار میں دیکھا جائے تو سب سے زیادہ اثر ملبوسات پر پڑا ہے۔ برصغیر کے خطے پر انگریزی سامراج نے تقریباً ایک صدی حکومت کی۔ اس عرصۂ حکمرانی میں انھوں نے جہاں دیگر بہت سی تبدیلیاں اس معاشرے میں کیں وہیں اس علاقے کا کلچر بدلنے کی طرف بھی خاص توجہ دی اور خصوصی کام کیے جس کے نتیجے

میں اس خطے میں انگریزی کلچر اس حد تک رواج پا گیا کہ آج آزادی کی پون صدی سے زیادہ گزارنے کے باوجود وہ کلچر یہاں سے نہ صرف نکل نہیں سکا بلکہ پہلے سے زیادہ مضبوط ہوتا جارہا ہے۔اس کلچر کا سب سے زیادہ شکار ملبوسات ہوئے۔ قمیض شلوار جو کہ یہاں کا مقبول لباس تھا اس کی جگہ انگریزی ملبوسات رواج پانے لگے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ سماج میں بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار میں ملبوسات کے حوالے سے دیکھا جائے تو رشید امجد کے افسانوں میں جہاں بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کی دیگر بہت سی صورتوں کی عکاسی ہوئی ہے وہاں ملبوسات میں تبدیلی کو بھی خاص طور پر بیان کیا گیا ہے۔رشید امجد نے ان اقدار کی تبدیلی کو بیان کرتے وقت سماجی صورت حال کے نقشہ خوب کھینچا ہے جس سے پورا سماجی منظر نامہ سامنے آجاتا ہے۔وہ ایک جوڑے کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "ایک موٹر سائیکل ٹیکسی کے برابر آکر رکتی ہے موٹر سائیکل پر ایک نوجوان جوڑا بیٹھا ہے لڑکے نے جین کی جیکٹ اور پتلون پہنی ہے۔لڑکی نے پتلون نما پائجامہ، سٹیئرنگوں کے پیچھے بیٹھے سارے مرد اسے دیکھتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے اور مزے سے ہارن بجاتے ہیں۔" (۱۸)

اس اقتباس سے جہاں ملبوسات میں تبدیلی کی عکاسی ہو رہی ہے وہاں لڑکی کو دیکھ کر مردوں کا ہونٹوں پر زبان پھیرنا اور مزے سے ہارن بجانا قاری کو اس سماجی منظر نامے کو سمجھنے میں کافی مدد دیتا ہے جو ثقافتی تبدیلی کی آڑ میں اس معاشرے میں واقع ہوا ہے۔ یہ تبدیلیاں صرف سماج کے کسی خاص طبقے میں نہیں ہوئی تھیں بلکہ جب ثقافتی یلغار بڑھی تو اکثریت اس ریلے میں بہتی چلی گئی اور معاشرہ اخلاقی پستی کا شکار ہوتا چلا گیا۔

اس منظر نامے میں دیکھا جائے تو لباس کے ساتھ ساتھ بول چال اور القاب و آداب میں بھی خاصی تبدیلی واقع ہوئی اور بہت سے رشتوں ناتوں کے اصل نام کی بجائے انھیں فرنگی ناموں سے پکارا جانے لگا یہ سلسلہ ابھی تک پوری آب و تاب سے جاری ہے۔انگریزی ثقافت سے مرعوب ہو کر ان کی سی وضع قطع اختیار کرنے کے بعد یہاں کے باشندوں نے رشتوں کے لیے بھی ان کے الفاظ استعمال کرنا شروع کر دیے۔ اس کے علاوہ ترقی یافتہ دور میں بہت سی کمپنیوں نے بہت سی نئی پروڈکٹس متعارف کروائیں۔ ان میں سے اکثر مصنوعات چوں کہ بیرون ملک کمپنیوں کی تھی اس لیے انھی کے دیے ہوئے نام ہی رائج ہوئے۔ اس کے علاوہ ان کمپنیوں نے اپنی مصنوعات کی فروخت کے لیے جب اشتہار بازی کا سلسلہ شروع کیا تو اپنی ثقافت کو بھی خاص طور پر سامنے رکھا جس کی وجہ سے اس اشتہار بازی کی بھینٹ چڑھ کر یہاں کی عوام بھی ویسے ہی انداز و اطوار اپنانے لگے اور ویسے ہی القاب و آداب سے

ایک دوسرے کو مخاطب کرنے لگے یوں یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا گیا۔ رشید امجد کے افسانوں میں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں بظاہر تو چھوٹی موٹی فرمائشیں ہی کی گئی ہوتی ہیں لیکن ان فرمائشوں کا انداز ایسا اختیار کیا گیا ہے کہ ایک ثقافتی منظر سامنے آجاتا ہے اور قاری یہ جاننے میں کافی حد تک کامیاب ہو جاتا ہے کہ ہماری ثقافتی اقدار کس حد تک تبدیل ہو کر رہ گئی ہیں۔ ذیل کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

"ڈیڈی"......

"جی بیٹے"......

"شام کو آئسکریم کھلانے لے جائیں گے نا۔"

"جی بیٹے"......

"میرے لیے ساڑھی...... میرے لیے...... میرے لیے......

دن فرمائشوں کے دھاگوں سے بنا ہوا دن۔" (۱۹)

بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کی وجہ سے جو رویے سماج میں پروان چڑھے ان میں سے ایک اہم رویہ نئی اور پرانی نسل کی سوچ اور چیزوں سے وابستگی کا ہے۔ وقت اور حالات سدا ایک سے نہیں رہتے بلکہ تغیر سے ہی زمانے کو ثبات ہے اگر تبدیلی کا عمل رک جائے تو دیگر امور کے ساتھ ساتھ انسان کی سوچ، عقل اور صلاحیتوں کے استعمال پر بھی جمود طاری ہو جائے جس کے نتیجے میں انسان محض ایک ہی چکر میں گھوم کر ساری عمر گزار دے اور ارتقاء کا عمل بند ہو جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان جمود کا شکار نہ ہونے پائے اور تبدیلی اور چیزوں کو نئے انداز میں دیکھنے کا رواج قائم رہے کہ یہی تبدیلی اور ارتقاء کا زینہ ہے۔ یہاں تک تو بات درست ہے لیکن اگر اس تبدیلی کو روایت سے مکمل طور پر منحرف کر دیا جائے اور مسلمہ روایات کے خلاف بغاوت کی جائے تو تصویر کا دوسرا رخ بڑا گھمبیر سامنے آتا ہے۔ رشید امجد کا افسانہ "عکس بے خیال" ایسی ہی صورت حال کو سامنے لاتا ہے۔ یہ صورت حال صرف دو لوگوں کی نہیں بلکہ دو تہذیبوں اور دو ثقافتوں کے درمیان کشمکش کو ظاہر کرتی ہے۔ ذیل کا اقتباس دیکھیے کہ کس طرح ثقافتیں آپس میں الجھتی نظر آتی ہیں۔

"ان کا یہ مسلسل اصرار ہے کہ بچے اب بڑے ہو گئے ہیں، اس لیے گھر بدلنا چاہیے اور یہ کہ یہ جگہ اب رہنے کے قابل نہیں، انہیں اندرون شہر گندگی اور بو کا احساس ہوتا ہے اور مجھے اندرون شہر اپنائیت اور خوشبو محسوس ہوتی ہے۔" (۲۰)

پرانی نسل کو اپنی ثقافت اور ہر وہ چیز عزیز ہے جس کے ساتھ اس نے زندگی بسر کی ہے کیوں کہ اس میں انھیں اپنائیت اور خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ یہ خوشبو ان حسین لمحات کی ہوتی ہے جو وہاں گزرے ہوتے ہیں اور اپنائیت ان یادوں کی ہے جو اس جگہ سے وابستہ ہیں کیوں کہ ایک عہد، ایک تہذیب اور ایک ثقافت وہاں گزر چکی ہوتی ہے جسے آسانی سے بھلانا کسی طور ممکن نہیں ہوتا۔ دوسری طرف نئی نسل ہے جو ثقافتی اقدار اور نئے سماجی منظر نامے میں اپنا آپ منوانے کی خاطر ہر وہ کام کرنے پہ مائل ہے جو نئی ثقافت اور نئے سماج سے ان کو ہم آہنگ کرنے میں مددگار ثابت ہو سکے۔ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے خواہ انھیں اپنے اسلاف کی یادوں اور ثقافت و تہذیب کی بھی قربانی دینی پڑے تو ان کے لیے یہ اس کی معمولی قیمت ہے۔ یہ بظاہر تو ایک تبدیلی نظر آتی ہے لیکن اس کے پیچھے آج کے عہد کا ایک بہت بڑا المیہ چھپا ہوا ہے کہ اس طرح اسلاف سے روگردانی اور ان کی خواہشات کو نظر انداز کرنے کے رواج سے سماج اخلاقی حوالے سے ابتری کی طرف بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔گھروں کی تعمیر زندگی کے تسلسل کے ساتھ ساتھ ہر دور میں ہوتی رہتی ہے لیکن گھر کو اس لیے بدلنا کہ یہ پرانا گھر اب رہنے کے قابل نہیں اس سے بدبو آتی ہے ایسے خیالات اسلاف کی تضحیک کے مترادف ہیں کیوں کہ جب وہ پرانا گھر بنایا گیا تھا تو اس وقت تو وہاں ایسی گندگی اور بدبو نہیں تھی۔ اب اگر یہ صورت حال ہے تو اس کی ذمہ دار وہ نئی نسل ہے جو اس معاشرے میں پروان چڑھی اور جنھوں نے خود کو بنانے سنوارنے کی تو بہت کوشش کی لیکن اسلاف کی روایات کے ساتھ ساتھ اسلاف سے وابستہ چیزوں سے بھی کنارہ کشی اس حد تک اختیار کر لی کہ اب ان کے نزدیک وہ جگہ رہنے کے قابل ہی نہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ نئی تہذیب کی پروردہ نسل اس گھر کو بدلتے دور کے ساتھ مزید بہتر کرتی چلی جاتی اور اس کی حفاظت کرتی لیکن ایسا نہ کیا گیا اور اب نوبت اسے یکسر تبدیل کرنے تک پہنچ گئی۔ یہ بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار معاشرے کو جس طرح متاثر کرتی چلی جارہی ہیں رشید امجد کے افسانوں میں اس کا بہترین اظہار ملتا ہے۔

سماج میں جو رویے سرایت کر جاتے ہیں تو لازمی طور پر ثقافت میں بھی ان کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ جب سماج سچائی، راست گوئی، حق بیانی اور بے خوفی کو رواج دے گا تو اس سماج کی ثقافت میں بھی یہی عناصر پروان چڑھیں گے جو اس کی آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ہوں گے یہی وجہ ہے کہ ہمارے ماضی میں ہمارا سماج اور ثقافت دونوں روشن تھے۔ سماج میں ایک دوسرے کا احساس اور ہمدردی تھی تو ثقافت بھی باہمی یگانگت اور بھائی چارے کا عملی نمونہ بن کر سامنے آتی تھی۔ سماج میں دھوکا دہی کو برا خیال کیا جاتا تھا تو تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بہت بڑے ثقافتی اجتماعات میں بھی ایک دوسرے کو دھوکا دینے کی بجائے ایک دوسرے کے لیے ایثار اور ہمدردی کے

جذبات ہی پیدا ہوتے تھے، لیکن موجودہ عہد میں ثقافتی تبدیلیوں اور ثقافتی ترقی کے نام پر جو تغیرات سماج میں واقع ہوئے ہیں انھوں نے پورے سماج کو اخلاقی حوالے سے ابتر بنا کر رکھ دیا ہے۔ اب ثقافتی اجتماعات تو ایک طرف عام روزمرہ کے امور میں بھی کوئی کسی پر بھروسہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ پورے کا پورا سماج ان بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کی بھینٹ چڑھ کر اپنی اصل سے اس حد تک دور ہو گیا ہے کہ اب معاشرے میں ہونے والی کسی بھی برائی کو روزمرہ کے معمول کی بات سمجھ لیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک اور بات جو یہاں بیان کرنا ضروری ہے کہ اس سماج میں سے اگر کوئی اس بددیانتی کے خلاف چلنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے راستے میں بھی رکاوٹ کھڑی کی جاتی ہے اور اسے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اس سماج میں ایسے ہی چلتے جانا ہے ورنہ اپنی بقاء کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ یہ وہ مجموعی بددیانتی کا رویہ ہے جو بدلتے حالات کے ساتھ اس معاشرے کا مقدر بن چکا ہے۔ جب صورت حال یہاں تک پہنچ جائے تو اہل اور قابل لوگوں کی صلاحیتوں سے محرومی اس معاشرے کا مقدر بن جاتی ہے، اہل اور قابل لوگوں کی صلاحیتوں کے استعمال کے بغیر کوئی سماج کس طرح پروان چڑھتا ہے اور اس میں کس طرح کی ثقافت رائج ہوتی ہے اس کا اندازہ موجودہ حالات کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ رشید امجد کے افسانوں میں ہمیں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں ایک طرف تو مختلف اداروں میں موجود کام چور اور بددیانت اہل کاروں اور افسران کے جرائم سے پردہ اٹھتا ہے دوسری طرف اس امر کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ کس طرح بددیانت لوگ دوسروں کو بھی بددیانتی کی طرف مائل کر کے سماج اور ثقافتی اقدار کو مجموعی بددیانتی کے گہرے کنویں میں دھکیلتے چلے جا رہے ہیں۔

"اُس نے پھر کچھ کہنا چاہا تو وہ بولے،" میں تمھیں پسند کرتا ہوں، جانتا ہوں تم ایک دیانت دار اور محنتی افسر ہو، لیکن بھائی ہم ایک سسٹم کے پرزے ہیں، اس کے مطابق نہیں چلیں گے تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ جاؤ لیٹر جاری کر دو۔" (۲۱)

یہ وہ اجتماعی بددیانتی ہے جو موجودہ عہد کے سماج اور ثقافتی اقدار میں اس قدر گھر کر چکی ہے کہ اب اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے سخت جان محنت کی ضرورت ہے۔ اس اجتماعی بددیانتی کو بددیانت لوگوں نے نام نہاد سسٹم کا نام دے رکھا ہے اور اس پر اس حد تک قابض ہوئے بیٹھے ہیں کہ اس کے خلاف چلنا اور دیانت داری اختیار کرنا گوارا نہیں بلکہ دیانت دار لوگوں اور اہل افراد کے لیے اس سسٹم کو مشکل بنایا جا رہا ہے۔ اس اجتماعی بددیانتی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ رشید امجد معاشرے کے مختلف امور اور افراد کے بارے میں گہرا مشاہدہ رکھتے

ہیں اور معاشرے میں موجود مختلف اداروں کے اہل کاروں کے حالات اور چالوں سے وہ اچھی طرح واقف ہیں۔اور وہ انھیں موئثر انداز میں بیان کرنے پر بھی قادر ہیں۔

بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کے حوالے سے دیکھا جائے تو جس بد دیانتی کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی سرکاری عہدیداران کی عیاشیاں ہیں۔ سرکاری عہدہ قوم کے باشندوں کی امانت ہوتا ہے اور جو امانت دار اس امانت کا حق ادا کرتا ہے اور اس میں خیانت نہیں کرتا بلکہ لوگوں کو نفع اور آرام پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔اس میں بے خوفی جنم لیتی ہے،وہ لوگوں میں گھل مل کر رہتا ہے اور لوگوں کے درمیان اس کا ہونا اس کی مقبولیت میں اضافے کا باعث بنتا ہے،ہماری اسلامی تاریخ و ثقافت ایسی لاتعداد مثالوں سے بھری پڑی ہیں کہ حکمرانِ وقت نے راتوں کو جاگ کر خود پہرے دیئے،لوگوں کی تکالیف اور احوال سے باخبر رہنے کے لیے خود گلی کوچوں میں نکل کر گشت کیے اور ان کی تکالیف کے ازالے کے لیے اپنی پیٹھ پر اناج کی بوری اٹھا کر ان کے گھر تک گئے، لیکن موجودہ حکمران جس ثقافت اور کلچر کو رواج دینے میں لگے ہیں اس میں اس سادگی اور خدمت کا کوئی شائبہ تک نظر نہیں آتا۔اب سب کچھ حکمرانوں کی عیاشی کے لیے ہو رہا ہے یہی وجہ ہے کہ حکمران خود کو بھی غیر محفوظ سمجھنے لگے ہیں۔وہ حکمران جن کا کام عوام کے دکھ درد کا مداوا کرنا تھا وہ اپنے محلات میں ہی سیکیورٹی کے خطرات کی وجہ سے محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔رشید امجد نے اپنے افسانوں میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

> "کبھی شہروں میں داخل ہونے کے لیے دروازے ہوتے تھے،اب دروازوں کی جگہ پولیس کے بیریئر ہیں۔ان پر ٹکی ہوئی بندوق کی نالی آنے والے کے سینے پر ہوتی ہے۔ہاتھ کھڑے کر کے تلاشی لی جاتی ہے، پھر ان بیریئر کو عبور کر کے شہر میں داخل ہوتے ہیں کہ اس کا مقصد لوگوں کی نہیں بادشاہ سلامت کی حفاظت ہے۔"(۲۲)

دروازوں کی جگہ لگے پولیس کے بیریئرز نے جہاں حکمرانوں کے دروازے عوام پر بند کر دیے ہیں وہیں حکمرانوں کے دلوں میں خود اپنی ہی عوام سے خطرے کا احساس پیدا کر دیا ہے۔اسی خطرے کے احساس نے جہاں محلات میں حکمرانوں اور عوام کا رشتہ کمزور کیا ہے وہاں محلات سے باہر بھی عام آدمی کو نچلے درجے میں لا پھینکا ہے۔حکمران وقت اور ان کی اولاد جس ٹھاٹ باٹ سے باہر نکلتے ہیں اور سیکیورٹی کے نام پر جو پروٹوکول ان کو دیا جاتا ہے وہ عوام سے ان کو دور رکھنے میں اہم کردار ادا کر رہا۔عوام بادشاہوں کے در پر ایک مجرم کی طرح کئی بار کی تلاشی کے بعد داخل ہونے کی اجازت حاصل کر پاتے ہیں،یہ کلچر موجودہ عہد کا ایک بہت بڑا المیہ بن چکا ہے۔

بادشاہوں کے پروٹوکول کے نام پر تمام روڈ بلاک کر دیئے جاتے ہیں اور عوام کی زندگی مفلوج کر دی جاتی ہے۔ کسی بھی معزز معاشرے میں اس بات کی اجازت نہیں دی جاتی کہ سیکورٹی اور پروٹوکول کے نام پر عوام کو اس اذیت سے گزارا جائے لیکن پاکستانی معاشرے کا یہ دستور ہے کہ بادشاہ سلامت کی سواری کے لیے عوام کے تمام راستے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ حکمرانوں کو اس بات کا بھی احساس نہیں ہوتا کہ کوئی بیمار شخص ان کے بے مقصد پروٹوکول کی وجہ سے جان کی بازی بھی ہار سکتا ہے۔ بادشاہ سلامت کی اس بے حسی اور بے رحمی کو بھی رشید امجد نے اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے کہ کس طرح وہ اپنے آپ کو زیادہ انسان سمجھتے ہیں۔ نام نہاد جمہوری راج میں ان بدلتے رویوں کو رشید امجد نے اپنے افسانے "بادشاہ سلامت کی سواری" میں اس طرح بیان کیا ہے۔

> "لیکن کچھ نہیں، سارجنٹ نے رکھائی سے جواب دیا۔ جب تک بادشاہ سلامت کی سواری نہیں گزرے گی، ٹریفک نہیں چلے گی۔
> واپس جانے سے پہلے سارجنٹ نے گھورتے ہوئے کہا..... اب ہارن نہ بجانا ورنہ سیدھے جیل جاؤ گے، اور ہاں ہیڈ لائٹ بھی بند کرو۔" (۲۳)

افسانہ نگار نے بادشاہ سے لے کر سارجنٹ تک تمام سرکاری مشینری کی بے حسی کو بیان کیا ہے۔ نوجوان نے کئی بار گزارش کی کہ اس کے والد بیمار ہیں اور دیر ہونے کی صورت میں ان کی موت واقع ہو سکتی ہے لیکن سارجنٹ نے اس کی بات کو قابل اعتناہی نہ سمجھا اور پھر وہی ہوا جس کا نوجوان کو خطرہ تھا۔ جب وہ والد کو ہسپتال لے کر پہنچا تو ڈاکٹر نے کہا افسوس آپ بیس منٹ لیٹ ہو گئے ورنہ آپ کے والد کی جان بچ سکتی تھی۔ وہی بیس منٹ جس میں بادشاہ کی سواری کو تحفظ دینے کے لیے تمام ٹریفک بند کر دی گئی تھی۔

بدلتے ہوئے حالات نے انسانی خوردونوش کی اشیا میں بھی خاص تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ اشیائے خوردونوش میں تبدیلی لانے والے عناصر کے پیچھے اصل میں وہ تجارتی کمپنیاں ہیں جو انسانی خوراک کی اشیاء تیار کرتی ہیں۔ ان کمپنیوں کا طریقہ واردات ایسا ہے کہ مال بھی بیچتی ہیں اور ثقافتی اقدار میں بھی تبدیلی لاتی ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ثقافتی اقدار کی تبدیلی میں ان کمپنیوں کے اشتہارات اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ انسانی خوراک کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ کمپنیاں اب ہر طرح کی خوراک تیار کر رہی ہیں۔ اس خوراک میں شیر خوار بچوں کے دودھ سے لے کر عمر رسیدہ اشخاص کے غذائی ٹانک تک سب کچھ ہی تیار کیے جا رہے ہیں اور ثقافتی یلغار میں آکر ان کا استعمال اس قدر بڑھ چکا ہے کہ انسان اصل خوراک اور اس کے اصل ذائقے سے لاعلم ہوتا چلا جا رہا ہے۔

پرانے وقتوں میں غذائی اجناس کی فراوانی سے ہر شخص کو مناسب مقدار میں خوراک مہیا تھی، یہ خوراک خالص ہونے کی وجہ سے جہاں غذائی ضروریات پوری کرتی تھی وہاں مسرت و شادمانی کا ذریعہ بھی تھی اور ثقافتی اقدار کے فروغ کا ذریعہ بھی۔ لوگ فصل کی کاشت اور کٹائی کے وقت جس باہمی بھائی چارے کا مظاہرہ کرتے تھے وہ اپنی مثال آپ تھا۔ گندم کی کٹائی کے موقع پر تو باقاعدہ ایک ثقافتی میلے کی سی صورت حال دیکھنے کو ملتی تھی، بیساکھی کے میلے ابھی تک مشہور ہیں۔ جب انسان نے مشینی زندگی اختیار کی تو ایک تو زیر کاشت رقبے پہ آدمیوں کی کھپت کم ہونا شروع ہو گئی کیوں کہ وہ تمام کام جو آدمی کرتے تھے اب مشینوں سے ہونے لگے، انسانی کھپت کے کم ہونے سے جہاں ایک طرف انسان ایک دوسرے سے دور ہو کر مشینوں کے محتاج ہوتے چلے گئے وہاں دوسری طرف جب کھیتوں میں آدمی کم اور مشینیں زیادہ ہو گئیں تو وہ عظیم ثقافتی اکٹھ بھی ختم ہوتے چلے گئے، اب ان کی جگہ کمپنیوں نے لے لی اور کمپنیوں کی تیار کردہ خوراک کھاتے ہوئے:

> "اسے پرانا محلہ یاد آ گیا۔ وہ تنگ سی لیکن محبت سے لبالب بھری گلی جو اسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیتی تھی، کلچے والے کی دکان جہاں سے وہ روز صبح گرم گرم کلچہ لیتا تھا، اور وہ دودھ والا لسی کا بھرا گلاس...... سارا دن کیا تازگی رہتی تھی اور اب ڈبل روٹی کے سوکھے ٹکڑے اور بدوضع جام، لگتا ہے میٹھی موم کھا رہے ہیں۔" (۲۴)

نئی تہذیب و ثقافت کی پروردہ نسل نے جب ترقی کے نام پر پرانی تہذیب اور ثقافت کو پس پشت ڈال دیا تو اس کے نتیجے میں ان کے ہاں رہن سہن کی سہولتوں میں تو خاطر خواہ اضافہ ہو گیا لیکن دلوں سے خلوص، محبت اور ایک دوسرے کا احساس ختم ہوتا چلا گیا۔ اس احساس کے خاتمے نے ایک افراتفری کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ انسان نے تمام سہولتیں تو حاصل کر لی ہیں لیکن ان کی قیمت آرام و سکون کو تج کر ادا کی ہے یہی وجہ ہے کہ اسے کسی بھی چیز میں کوئی لذت محسوس نہیں ہوتی۔ لذت اور تسکین نہ ملنے کی ایک بڑی وجہ اشیا کا کھوکھلا پن بھی ہے۔ جوں جوں انسان نئی ثقافتی اقدار کو اپناتا چلا گیا وہ اندر سے کھوکھلا ہوتا چلا گیا اور یہی کھوکھلا پن اس کی تمام اشیا میں بھی شامل ہوتا چلا گیا اور وہ سب کچھ حاصل کر لینے کے باوجود ماضی کی یاد سے نہ نکل سکا۔ رشید امجد کے الفاظ میں آج کا انسان سوچ رہا ہے کہ:

> " نہ کسی سبزی میں، نہ کسی پھل میں، کسی شے میں ذائقہ نہیں ہے۔ ذائقہ تو اب زندگی میں بھی نہیں۔ ہر شے سپاٹ ہو گئی ہے۔ ایک زمانہ تھا، کپڑے دھونے والے صابن

> سے نہاتے ہوئے کتنا اچھا لگتا تھا۔ اب جیل تھے، باتھ واش تھے، ماؤتھ واش تھے۔ واش ہی واش، خوشبوؤں سے بھرے لیکن خوشبوؤں میں لذت نہیں تھی، ان کا ذائقہ نہیں تھا، بس باتھ روم سجا ہوا تھا۔ اسے پرانا پاخانہ، کمرے کے کونے میں بالٹی سے نہانا، پھر پرانا باتھ روم اور اس کی لذت یاد آتی۔ ان کا خیال کر کے ہنسی آتی۔ اپنے آپ سے کہتا، ''وہ جو کچھ تھا اس میں ایک مزہ تو تھا اور اب سب کچھ تھا مگر مزہ ہی نہیں تھا!'' (۲۵)

مزہ اور تسکین مل بھی کیسے سکتے ہیں کہ ان کے لیے جس ذہنی بالیدگی کی ضرورت ہوتی ہے وہ انسان سے رخصت ہو چکی ہے۔ آج کا انسان ثقافت کی بدلتی ہوئی اقدار کو اپناتے ہوئے اس قدر آگے نکل گیا ہے کہ اسے اپنے ماضی کی بازیافت کے لیے بھی اب سخت جان مارنے کی ضرورت ہے۔ وہ ماضی کو چھوڑ چکا ہے اور حال میں اسے تسکین نہیں ہے۔ اس کا کردار ایک مشین کا سا بن کر رہ گیا ہے جس کا واحد مقصد وقت پر چلنا اور ایک خاص مقدار تک مصنوعات پیدا کرنے کے بعد وقت پر بند ہو جانا ہے، جس طرح مشین نہ تو خود چل سکتی ہے اور نہ ہی خود بند ہو سکتی ہے اسی طرح آج کا انسان بھی زندگی کی دوڑ میں دوسروں اور خاص طور پر مشینوں کا پابند ہو کر رہ گیا ہے۔ اب انسان اپنی مرضی سے نہیں چل رہا بلکہ مشین اسے چلائے جا رہی ہے اور وہ مصنوعات بڑھانے میں مشین کا معاون بنا ہوا ہے۔

سائنسی یلغار نے کئی ممالک کی ثقافت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ پاکستان میں بہت سی رسومات اسی سائنسی یلغار کے نتیجے میں دوسرے ممالک سے آئی ہیں مثلاً سالگرہ کا منانا۔ اسلام میں تو ایسی کوئی روایت نہیں ہے کہ زندگی کا ایک سال کم ہونے پر کیک کاٹا جائے اور خوشی کا اظہار کیا جائے۔ لیکن اب یہ کلچر پاکستانی ثقافت کا حصہ بن چکا ہے۔ اب یہ ثقافت صرف امیر لوگوں تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ لوگ جو بنیادی ضروریات زندگی سے محروم ہیں وہ بھی بچوں کی سالگرہ منانا ضروری سمجھتے ہیں۔ ایک اور بات جو ثقافتی تبدیلی کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ زندگی کا ایک سال گزارنے کے بعد اپنا احتساب نہیں کیا جاتا کہ کیا کھویا اور کیا پایا بلکہ صرف جشن منایا جاتا ہے۔ کیک کاٹنا اور جشن منانا درست سہی لیکن اس بات کو نظر انداز کر دینا کہ اخروی زندگی کو بھی کامیاب بنانا ہے، اسی میں نجات ہے انسان کی کم عقلی ہے۔ سالگرہ کے دن تین سو پینسٹھ دنوں کا اس لحاظ سے احتساب بھی بہت ضروری ہے۔ اس بات کا حساب کہ ان تین سو پینسٹھ دنوں میں اپنی ہمیشہ کی زندگی کے لیے کیا زادِ راہ اکٹھا کیا ہے۔

اس ثقافتی تبدیلی میں ایک اور تبدیلی جو دیکھنے میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ سالگرہ کی یہ تقریبات اب روایتی طریقے کے برعکس بھی منعقد کی جاتی ہیں۔اب کچھ لوگ تو پاکستان میں موجود ہوتے ہیں اور کچھ بیرون ملک اور سکرین کے سامنے بیٹھ کر کیک کاٹا جاتا ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب اہم موقعوں پر بھی اپنے ایک جگہ جمع نہیں ہوتے۔اب عیدین، شب راتیں، شادیاں اور تمام تقریبات میں شمولیت سکرین کے زریعے ہی کر لی جاتی ہے۔ جدید دور کی اس ثقافت کو رشید امجد نے اپنے افسانے ''گماں کے رشتے'' میں اس طرح بیان کیا ہے۔

> '''' بچے کے بڑھنے کا ایک ایک لمحہ ان کے سامنے تھا۔اس کی پہلی سالگرہ اس طرح منائی گئی کہ سکرین کے سامنے وہ لوگ اور سکرین کے اندر بیٹی، داماد اور نواسہ، کیک کاٹا گیا۔بیٹی نے بچے سے کہا۔"وہ دیکھو نانا ابو۔نانی اماں"
>
> اس نے سوچا۔"شاید فاصلے کوئی معنی نہیں رکھتے"
>
> اب جب بھی نیٹ کھلتا۔بیٹی اپنے بیٹے کو کہتی۔"کہو نانا۔نانا"(۲۶)

اس نے سوچا۔شاید فاصلے کوئی معنی نہیں رکھتے''لیکن ایسی بات نہیں ہے۔دراصل افسانہ نگار یہ بات کہنا چاہتا ہے کہ فاصلے معنی رکھتے ہیں۔وہ اس لیے کہ تصویروں اور کاغذوں کے رشتے بہت کمزور ہوتے ہیں۔یہ رشتے جدید دور کے ہیں، بہت جلدی قائم ہوتے ہیں اور اتنے ہی ناپائیدار ہوتے ہیں۔بلاشبہ یہ جدید ثقافت ہے کہ آج کل لڑکی لڑکا ایک دوسرے کو سکرین پر پسند کرتے ہیں اور شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں، سکریں پر ہی زندگی گزار لیتے ہیں۔سکریں پر ہی اپنے پیاروں کو دفن ہوتے دیکھ لیتے ہیں۔سکریں پر سے ہی خریداری کر لیتے ہیں۔لیکن کیا یہ سکرین عملی زندگی کا متبادل ہو گئی ہے، ہر گز نہیں۔دراصل اس سکرین نے رشتوں اور جذبات کو بہت کمزور کر دیا ہے۔وہ بچے جن کے ساتھ صرف سکرین پر رابطہ رہتا ہے وہ اپنے بزرگوں تک کو نہیں پہچانتے۔اس ضمن میں رشید امجد لکھتے ہیں۔

> "یہ تو ہمیں پہچانتے ہی نہیں، اس نے روہانسی آواز میں بیوی سے کہا اور سوچا۔
>
> رشتے صرف کاغذوں میں نہیں ہوتے، فاصلے بھی اہم ہوتے ہیں۔" (۲۷)

آبادی میں تیزی سے ہوتے اضافے اور لوگوں کی دیہاتوں سے شہروں کی طرف نقل مکانی نے بھی پرانی ثقافت کو کافی متاثر کیا ہے۔اب لوگ چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہنے پر مجبور ہیں جن میں صحن ہیں نہ لان اور تنگ و تاریک گلیاں ایک خوفناک منظر پیش کرتی ہیں۔ان تنگ و تاریک گلیوں میں ہوا اور روشنی کا گزر بھی نہیں ہوتا

چھت تو رہی ہی نہیں کہ چارپائی ڈال کے چھت پر بیٹھ جائیں۔ جس تیز رفتاری سے گھر اور گلیاں تنگ ہو رہی ہیں اس سے زیادہ تیزی سے افراد کے دل تنگ اور تاریک ہو رہے ہیں۔ ابتداء میں تو دو منزلہ گھر ہی تعمیر کیے جاتے تھے لیکن پھر یہ منزلیں بڑھتی گئیں اور اب تو تاریک و تنگ فلیٹ تیار کیے جاتے ہیں، ساٹھ ستر منزلوں کے فلیٹ کہ جن میں دھوپ اور روشنی کا گزر ہی نہیں ہوتا۔ ابتدا میں یہ فلیٹ بیرونی ممالک میں بنائے جاتے تھے لیکن جلد ہی پاکستانی معاشرے نے بھی اس کلچر کو اپنا لیا اور اب پاکستان کے بڑے شہروں میں بھی کئی منزلوں کے فلیٹ تیار کیے جاتے ہیں۔

مغربی طرز کی ان رہائشوں میں رہنے والے لوگ اللہ تعالیٰ کی مفت اور بے پایاں نعمتوں سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ تازہ ہوا ان کے پھیپھڑوں تک نہیں پہنچ پاتی، روشنی اور دھوپ سے بھی محروم رہتے ہیں۔ یوں نعائم فطرت سے محروم ہونے کی وجہ سے کئی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے لوگوں کی عمریں گھٹ رہی ہیں ۔اس ماحول نے لمبے قد اور اچھی صحت کو بھی معدوم کر دیا ہے۔ یہ بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کا اثر ہے کہ صحت ناپید اور بیماریاں عام ہو رہی ہیں۔ رشید امجد نے ثقافت کی ان تبدیلیوں کا ذکر بھی اپنے افسانوں میں کیا ہے۔ اپنے افسانے ''اپنی اپنی بلی'' میں تحریر کرتے ہیں:

"اس نے رشک سے اس کی طرف دیکھا.....ولا میں تو آدمی زمیں پر ہوتا ہے نا
سعد کو اس کی بات کی سمجھ نہ آئی، کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا.....تو آپ زمیں پر نہیں رہتے۔
وہ ہنس پڑا..... نہیں میں تو فلیٹ میں رہتا ہوں، وہ بھی ساٹھویں منزل پر
سعد کو اب بھی اس کی بات سمجھ نہ آئی، بولا.....فلیٹ زمیں پر نہیں ہوتے؟
ہوتے ہیں اور نہیں بھی ہوتے اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا" (۲۸)

انسان کی پریشانی کے اسباب تلاش کرنا اور پھر انھیں اپنے مخصوص انداز میں تہذیب و ثقافت کو سامنے رکھتے ہوئے پرکھنا اور نتائج حاصل کرنا رشید امجد کا خاص وصف ہے۔ جدید اردو افسانے میں جو بہت سے رجحانات سامنے آئے ہیں ان سب پر وہ خاصی دسترس رکھتے ہیں۔ وہ بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کے نتیجے میں معاشرے پہ ہونے والے اثرات سے بھی گہری واقفیت رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کے حوالے سے خاصی عکاسی ملتی ہے۔ فنی حوالے سے دیکھا جائے تو یہاں بھی وہ بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کو بڑی فن کاری اور مختلف

انداز کی پیکر تراشی سے سامنے لاتے ہیں۔ بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار نے سماج میں جو رویے پروان چڑھائے ہیں خواہ وہ مثبت ہوں یا منفی رشید امجد کے افسانوں میں ان سب رویوں کی خوب عکاسی ملتی ہے۔ وہ ایک ماہر نباض کی طرح سماج کی ہر رگ سے واقف ہیں اور سماج کی بدحالی پر نوحہ کناں نظر آتے ہیں۔ وہ عصر جدید کے ایک بیدار مغز افسانہ نگار ہیں وہ معاشرے پر تنقید کے نشتر بھی چلاتے ہیں اور اس ثقافتی بگاڑ کی اصلاح کے بھی خواہاں ہیں۔

## حوالہ جات


۱۔ عابدہ بتول، ''عام آدمی کے خواب''، مشمولہ سہ ماہی اسالیب، سرگودھا، مدیر، ذوالفقار احسن، شمارہ ۱۱ جولائی تا ستمبر ۲۰۱۰، ص ۲۰

۲۔ رشید امجد، ''لیمپ پوسٹ''، مشمولہ بے زار آدم کے بیٹے، راولپنڈی: دستاویز پبلیشرز، ۱۹۷۴، ص ۱۳

۳۔ رشید امجد، ''ٹوٹے پر، لمحہ لمحہ، زرد کبوتر''، مشمولہ بے زار آدم کے بیٹے، ص ۲۴

۴۔ رشید امجد، ''جاگتی آنکھوں کے خواب''، مشمولہ ریت پر گرفت، راولپنڈی: ندیم پبلی کیشنز، ۱۹۷۸، ص ۲۳۸

۵۔ رشید امجد، ''گم راستہ میں کشف''، مشمولہ پت جھڑ میں خود کلامی، راولپنڈی: اثبات پبلی کیشنز، ۱۹۸۴، ص ۴۹

۶۔ رشید امجد، ''جنگل شہر ہوئے''، مشمولہ بھاگے ہے بیاباں مجھ سے، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۸، ص ۹۷

۷۔ رشید امجد، ''سمندر مجھے بلاتا ہے''، مشمولہ بھاگے ہے بیاباں مجھ سے، ص ۵۸

۸۔ رشید امجد، ''جنگل شہر ہوئے''، مشمولہ بھاگے ہے بیاباں مجھ سے، ص ۸۷

۹۔ رشید امجد، ''سناٹا بولتا ہے''، مشمولہ عام آدمی کے خواب، راولپنڈی: پورب اکادمی، ۲۰۱۰، ص ۴۶۷

۱۰۔ رشید امجد، ''ٹوٹے پر، لمحہ لمحہ، زرد کبوتر''، مشمولہ بے زار آدم کے بیٹے، ص ۲۴

۱۱۔ رشید امجد، ''سمندر مجھے بلاتا ہے''، مشمولہ بھاگے ہے بیاباں مجھ سے، ص ۲۵

۱۲۔ رشید امجد، ''لمحہ جو صدیاں ہوا''، مشمولہ بھاگے ہے بیاباں مجھ سے، ص ۲۷

۱۳۔ رشید امجد، ''سفر کشف ہے''، مشمولہ بھاگے ہے بیاباں مجھ سے، ص ۸۷

۱۴۔ رشید امجد، ''بیزار آدم کے بیٹے''، مشمولہ بے زار آدم کے بیٹے، ص ۱۰۹

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۱۰

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۱۷۔ رشید امجد، ''طناب ٹوٹا خیمہ''، مشمولہ سہ پہر کی خزاں، راولپنڈی: دستاویز پبلیشرز، ۱۹۸۰، ص ۲۷

۱۸۔ رشید امجد، ''طناب ٹوٹا خیمہ''، مشمولہ سہ پہر کی خزاں، ص ۳۰۲

۱۹۔ رشید امجد، ''بند کنویں میں سرسراہٹ''، مشمولہ بھاگے ہے بیاباں مجھ سے، ص ۱۳۵

۲۰۔ رشید امجد، ''عکسِ بے خیال''، مشمولہ عکس بے خیال، دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶، ص ۷۷

۲۱۔ رشید امجد، ''حسرت چشیدہ''، مشمولہ دُکھ ایک چڑیا ہے، اسلام آباد: نیشنل بک فائونڈیشن، ۲۰۱۶، ص ۱۰

۲۲۔ رشید امجد، ''رات''، مشمولہ عام آدمی کے خواب، ص ۸۳۸

۲۳۔ رشید امجد، ''بادشاہ سلامت کی سواری''، مشمولہ عام آدمی کے خواب، ص ۸۹۷

۲۴۔ رشید امجد، ''عشق نہ پُچھے''، مشمولہ عام آدمی کے خواب، ص ۶۰۷

۲۵۔ رشید امجد، ''مسکراتے لمحے سے نکلی ایک افسردہ کہانی''، مشمولہ دُکھ ایک چڑیا ہے، ص ۲۴

۲۶۔ رشید امجد، ''گماں کے رشتے''، مشمولہ دُکھ ایک چڑیا ہے، ص ۱۴۴

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۴۵

۲۸۔ رشید امجد، ''اپنی اپنی بلی''، مشمولہ دُکھ ایک چڑیا ہے، ص ۲۴۶